طاہرہ اقبال کے ناول "نیلی بار" میں رچناوی ثقافت کی پیش کش

Presentation Of Rachnavi Culture In Tahira Iqbal's Novel "Neeli Bar"

[i] خاور حسین [ii] ڈاکٹر واصف اقبال صدیقی

Abstract:

Tahira Iqbal's novel Neeli Bar offers a profound exploration of the Rachnavi culture, intertwining its historical, cultural, and sociological elements within a narrative framework. The novel vividly portrays the unique traditions, customs, and daily life of the region's people, emphasizing their resilience and cultural richness. Tahira Iqbal's literary prowess is evident as she delves into the dynamics of feudalism, rural struggles, and the marginalized communities' challenges in Central Punjab. By weaving cultural elements like folk songs, local crafts, and rituals into the storyline, the author creates a vibrant tapestry of Rachnavi life. Her critique of societal norms and depiction of women's roles further adds depth to the narrative. Neeli Bar stands out as a significant cultural and literary text, celebrating the essence of regional identity while addressing universal themes of human resilience, cultural preservation, and social justice.

Keywords: *Tahira Iqbal, Neeli Bar, Rachnavi culture, Urdu fiction, Feudalism, Rural life, Punjabi traditions, Cultural heritage, Social critique, Women's roles.*

طاہرہ اقبال کا ناول ''نیلی بار'' رچناوی ثقافت کی گہری جھلک پیش کرتا ہے ، جس میں تاریخی ، ثقافتی اور معاشرتی عناصر کو ایک کہانی کے سانچے میں ڈھالا گیا ہے ۔ ناول اس خطے کے لوگوں کی منفرد روایات ، رسوم اور روزمرہ زندگی کو نہایت جان دار انداز میں پیش کرتا ہے ، جس میں ان کی استقامت اور ثقافت پر زور دیا گیا ہے ۔ طاہرہ اقبال کی ادبی مہارت اس وقت نمایاں ہوتی ہے جب وہ جاگیرداری نظام ، دیہی زندگی کی جدوجہد اور وسطی پنجاب کی پس ماندہ برادریوں کو درپیش مسائل کا گہرائی سے تجزیہ کرتی ہیں ۔ وہ لوک گیتوں ، مقامی دستکاریوں اور رسوم و روایات جیسے ثقافتی عناصر کو کہانی میں اس خوبصورتی سے بُنتی ہیں کہ قاری کو ایک زندہ اور متحرک رچناوی زندگی محسوس ہوتی ہے ۔ معاشرتی روایات پر تنقید اور عورتوں کے کردار کی تصویر کشی کہانی کو مزید گہرائی عطا کرتی ہے ۔ ''نیلی بار'' ایک اہم ثقافتی اور ادبی متن کے طور پر ممتاز ہے ، جو علاقائی شناخت کی روح کو بتانے کے ساتھ ساتھ انسانی حوصلے ، ثقافتی تحفظ اور سماجی انصاف جیسے عالمی موضوعات کو بھی مخاطب کرتا ہے ۔

کلیدی الفاظ: طاہرہ اقبال ، نیلی بار ، رچناوی ثقافت ، اُردو افسانہ ، جاگیرداری ، دیہی زندگی ، پنجابی روایات ، ثقافتی ورثہ ، سماجی تنقید ، خواتین کے کردار ۔

طاہرہ اقبال کا شمار جدید فکشن لکھنے والوں میں ہوتا ہے۔ اُردو ناول کی تاریخ میں یہ چیز ضرور دیکھنے کو ملی ہے کہ بہت کم ادیب عصری مسائل کو کہانی کا موضوع بنانے میں کامیاب ہوئے۔ طاہرہ اقبال کو یہ اختصاص حاصل ہے کہ وہ دورِ حاضر کے مسائل کو سامنے رکھ کر ماضی کے تاریخی المیوں کو بھی کہانی کا موضوع بناتی ہیں۔ انھوں نے بہت سے متنوع موضوعات کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا ہے۔ بطور ناول نگار وہ ایک زیرک لکھاری ہیں۔ سب سے اہم چیز یہ ہے کہ انھوں نے اپنی دھرتی، رہتل کی ارزل نسلوں کے مسائل،

[i] سکالر پی ایچ۔ڈی (اردو)، دی اسلامیہ یونی ورسٹی آف بہاول پور۔(Corresponding Author)
[ii] اسسٹنٹ پروفیسر (اردو)، دی اسلامیہ یونی ورسٹی آف بہاول پور۔

دکھوں کو کہانی کا موضوع بنایا ہے۔ ناول اور بالخصوص تہذیبی ناول تخلیق کرنا جان جوکھوں والا کام ہے مگر طاہرہ اقبال نے نیلی بار، گراں اور ہبڑپہ ایسے ناول تخلیق کرکے اپنی تہذیب کو زندہ کر دیا ہے۔ طاہرہ اقبال کے متعلق شاہ محمد مری لکھتے ہیں:

> طاہرہ اقبال ایک روشن فکر لکھاری ہے۔ اُسے سماج بالخصوص دیہی سماج پر مسلط فیوڈل ازم کی چیرہ دستیاں بیان کرنا آتا ہے۔ وہ بہت بہادری کے ساتھ رواجوں، رسموں اور روایتوں پہ بلڈوزر پھیرتی ہوئی اپنی کہانی کا راستہ بناتی جاتی ہے۔ وہ اس نظام سے نفرت کرتی ہیں۔ اسے تبدیل ہوتا دیکھنا چاہتی ہے۔[1]

طاہرہ اقبال جاگیر دارانہ نظام سے بے حد نفرت کرتی ہیں۔ انھوں نے جاگیر دارانہ نظام کی خرافات اور خرابیوں کو اپنی کہانیوں میں پیش کیا ہے جو ہمیشہ سے عام انسانوں کا استحصال کرتے چلے آرہے ہیں۔ اُردو فکشن بالخصوص اُردو ناول میں جو نمایاں مقام انھیں حاصل ہے وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔

ثقافت کے متعلق بات کی جائے تو ابتدائے آفرینش سے جہاں انسان کو دیگر مسائل کا سامنا رہا، وہیں سب سے اوّلین چیز ثقافت تھی کہ انسان نے رہنا کیسے ہے؟ جینے کے قرینے کیا ہوں گے؟ تو یوں انسان نے جینے کے تمام قرینے تہذیب و ثقافت سے اخذ کیے۔ پھر جب تہذیبوں نے قدیم دور سے نکل کر جدید دور میں مراجعت کی تو ثقافتی معیارات بدلتے گئے۔ انسان کا رہن سہن، رسوم و رواج اور دیگر بہت سی چیزیں ثقافت کی مرہونِ منت ہیں۔ ثقافت کے متعلق ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں کہ "تہذیب اور کلچر کے فرق کو دریا اور اس کی لہروں سے سمجھا جاسکتا ہے۔ تہذیب ایک تسلسل کا نام ہے اور یہ دریا کے بہاؤ کی مانند ہے۔ ایسا دریا جس کا منبع کہیں دور ماضی بعید کی تاریکی میں نہاں ہے اور اسی دریا کے مختلف مقامات پر اُبھرتی اور ڈوبتی لہریں کلچر۔"[2] جب کہ ثقافت کے متعلق سبطِ حسن کی رائے ہے کہ "انگریزی زبان میں تہذیب کے لیے "کلچر" کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ کلچر لاطینی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے لغوی معنی ہیں "زراعت، شہد کی مکھیوں، ریشم کے کیڑوں، سیپوں اور بیکٹیریا کی پرورش یا افزائش کرنا، جسمانی یا ذہنی اصلاح و ترقی، کھیتی باڑی کرنا۔"[3]

ثقافت انسانی حیات کا حصہ ہے جو ازل تا ابد رہے گا۔ جہاں تک رچناوی ثقافت کی بات ہے تو یہ ثقافت بھی بہت قدیم ہے۔ یہاں کے باشندوں نے بڑے بڑے سپوت پیدا کیے اور مزاحمت کی داستانیں رقم

کیں۔ رچناوی ثقافت بہت مبسوط اور مضبوط ہے جو دیگر ثقافتوں سے بہت منفرد اور مختلف بھی ہے۔ رچناوی تہذیب و ثقافت کی قدامت کے متعلق منیر ابنِ رزمی لکھتے ہیں:

> رچناوی تہذیب، عراق کی سمیری تہذیب سے بھی پرانی تہذیب ہے۔ المیہ یہ ہوا کہ اُسے بڑے شہروں کے کاغذی دانش وَروں نے شیوۂ بے اعتنائی کی نظر سے دیکھا۔ بے حسی اور ناقدری کی رائیگانی نے مصنف کو ''راوی راشکاں'' اور ''چناں عاشقاں'' کی عظمت کو اُجاگر کرنے کی تحریک دی۔[۴]

رچناوی ثقافت کی رہتل کے جو رسوم ورواج، رہن سہن، لوک تفریحات کے علاوہ بہت سی چیزیں ہیں جو بہت منفرد ہیں اور دیگر تہذیبوں کی ثقافت میں اسے ممتاز رکھے ہوئے ہیں۔ نیلی بار ناول میں رچناوی ثقافت کا بھرپور عکس پیش کیا گیا ہے۔ مصنّفہ نے گہرے تہذیبی مشاہدات کے باعث بہت عمدہ انداز سے ثقافتی رنگوں کو ناول میں پرویا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نیلی بار ناول کی ثقافتی اہمیت کے متعلق لکھتے ہیں کہ:۔

> طاہرہ کا ناول بولتا ہے۔ آوازوں کا غدر مچ جاتا ہے۔ زمینی مناظر زندہ ہو جاتے ہیں۔ ڈاچیاں بلبلاتی ہیں، کجاووں میں براجمان عورتوں کے بدن دوہائی دینے لگتے ہیں۔ کماد اور شٹالے کے کھیتوں میں سے پیراہن سنبھالتی حسین دیویاں بہت سیاہ رنگت کی ظاہر ہونے لگتی ہیں۔ دربار لگ جاتے ہیں اور انار چھوٹنے لگتے ہیں۔۔۔ اور جب آندھی کا سرخ غبار اُٹھتا ہے تو اس کی گونج سنائی دینے لگتی ہے۔ نیلی بار پنجاب کا ایک مہابیانیہ ہے۔ وہ مہابھارت کے یُدھ کی ہمسری کرتا، ہومر کے ''ایلیڈ'' کو چیلنج کرتا ہے۔۔۔ وارث شاہ کے بیانیے کی قربت میں چلا جاتا ہے۔[۵]

طاہرہ اقبال نے بڑے اِنہماک سے رچناوی کی دیہی ثقافت کے رنگوں کو اُبھارا ہے اور یہ رنگ اتنے دلکش ہیں کہ قاری کے دل میں کھبتے چلے جاتے ہیں اور بات یہاں بھی نہیں ٹھہرتی، بسا اوقات کچھ ایسے ثقافتی رنگ ہیں جو قاری کی آنکھوں کے سامنے آن کھڑے ہوتے ہیں۔ یوں نیلی بار ناول سے بڑھ کر ثقافتی و تہذیبی رنگوں کے مرقع کا روپ دھار لیتا ہے۔ ڈاکٹر شاہ محمد مری، طاہرہ اقبال کی دیہی ثقافت کی لکھت پر لکھتے ہیں کہ:۔

طاہرہ پنجاب کے دیہات کی قصہ خوانی کرتی ہے۔ دیہات اس کی کہانی کے ٹیک سنگھ کاٹوبہ ہے۔ سچی، کھری، بے حجاب اور حقیقی سچی کہانیاں۔[۶]

نیلی بار طاہرہ اقبال کا پہلا ناول ہے جو پہلی بار دوست پبلی کیشنز اسلام آباد سے ۲۰۱۷ء میں شائع ہوا جب کہ دوسری بار بک کارنر جہلم نے حال ہی میں شائع کیا ہے۔ نیلی بار وسطی پنجاب کا علاقہ ہے۔ موجودہ علاقے جو اس بار کے احاطے میں شامل ہیں، ان میں وہاڑی، بورے والا، چیچہ وطنی، کسووال، ساہی وال، اوکاڑہ، پاک پتن اور عارف والا آتے ہیں۔ دراصل نیلی بار کا جغرافیہ دریائے راوی اور دریائے ستلج کے درمیان واقع ہے۔ دریائے ستلج کے نیلے پانیوں کی نسبت سے اس بار کا نام نیلی بار رکھا گیا ہے۔ اس بار کے قدیم باشندوں نے دریا کی ساحلی پٹی پر بستیاں آباد کر رکھی تھیں۔ جنگلوں کی زندگی بسر کرتے۔ یہاں کے عام لوگ دراصل اُجڈ، اَن پڑھ، بکریوں کے چرواہے، بھینسوں کے چھیڑو اور اونٹوں کے شتر بان تھے جس بناء پر انھیں جانگلی بھی کہا گیا۔ پھر ایک وقت کے بعد ان جانگلیوں نے مختلف دیہاتوں اور چکوک کی طرف رُخ کیا اور بستیاں آباد کیں۔ انھی علاقوں میں مہاجروں کی بڑی تعداد بھی دَر آئی جو ہجرت کے المیے کی نازک اور کرب ناک صورتِ حال میں آئی۔ طاہرہ اقبال نے نیلی بار کے خطے میں غوطہ زن ہو کر ثقافتی نقوش کو دکھایا ہے۔ طاہرہ اقبال ایک زیرک ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ مؤرخ بھی ہے جس نے نیلی بار میں عام لوگوں کی مفلوک الحالی، کس مپرسی اور حالتِ زار کو بہت ہی آسان اور شستہ انداز میں دکھایا ہے کہ جہاں کے قبضہ گیروں، سیاسی جگادریوں، اور گدی نشینوں نے کس طرح ان لوگوں کی ناک میں نکیل ڈال کر اپنی منشا و مرضی سے ہانکے رکھا۔ باوجود اس ظلم و ستم کے وہاں کی رہتل اور دھرتی کے لوگوں نے اپنی زمین، اقدار اور ثقافت سے محبت اور عقیدت برقرار رکھی۔ مصنّفہ نے نیلی بار ایسا ناول تخلیق کر کے انھی لوگوں کی دھرتی سے جڑت اور محبت کو زندہ کر دیا ہے۔

رچناوی تہذیب کی قدامت کے متعلق الطاف حسین لنگڑیال لکھتے ہیں کہ:۔

پنج دریاواں یا پنجاب دی تہذیب دریا راوی تے اوہدے اوروں پروں وگن آلے اس دے بھرا دریاواں نیلی، ویاہ، چناں تے جہلم دی تہذیب ہے۔ راوی کھبی کدھی تے ہڑپہ دے آثارِ قدیمہ دی دریافت تے اُتھوں ملن آلیاں کتبیاں دے لیبارٹری ٹیسٹ (DNA Test) تواس دی عمر چھبیس ہزار سال پرانی متعین کیتی گئی اے۔ تے انہاں کتبیاں دیاں

لکھتاں تے ترجمیاں توں ثابت ہویا اے جوں اوس ویلے وی ایس علاقے تے ایس دے اوروں پروں دے علاقیاں اچ پنجابی بولی جاندی ہائی۔[۷]

[ترجمہ: پانچ دریاؤں یا پنجاب کی تہذیب دریائے راوی اور اس کے ارد گرد بہنے والے اس کے بھائی دریاؤں نیلی، ویاہ (بیاس)، چناں (چناب) اور جہلم کی تہذیب ہے۔ راوی کے بائیں کنارے پر ہڑپہ کے آثارِ قدیمہ کی دریافت اور وہاں سے ملنے والے مخطوطات کے لیبارٹری ٹیسٹ (DNA Test) سے اس کی عمر چھبیس ہزار سال قدیم متعین کی گئی ہے۔ ان لکھے گئے مخطوطات کے تراجم سے یہ ثابت ہوا ہے کہ اس وقت بھی اس علاقے کے گردونواح کے علاقوں میں پنجابی بولی جاتی تھی۔]

محقق کی یہ رائے رچناوی ثقافت کے ساتھ ساتھ زبان کی قدامت کو بھی پیش کرتی ہے۔ یہ بات بھی اظہر من الشّمس کسی بھی علاقے یا خطے کی ثقافت اس علاقے کی زبان کے توسط سے ہی پروان چڑھتی ہے۔ اس لیے رچناوی کے لوگوں کی ثقافت بھی قدیم سے ہی ایک مضبوط ثقافت جس کے خدوخال عہدِ جدید میں بھی دکھائی دیتے ہیں۔ نیلی بار میں مصنّفہ نے اس ثقافت کو نہایت عمدہ انداز سے پیش کیا ہے۔ طاہرہ اقبال نے کھیت کے بنّے پر لسّی کی کجی سر پر دھرے مٹک مٹک کر مٹیاروں کو دکھایا ہے اور ان کی چالوں پر فدا ہوتے لڑکے، بالوں کو بھی دکھایا ہے۔ ڈھولے اور ماہیے گاتے کسان، ہاریوں کو بھی دکھایا ہے جو محبت، امن و آشتی سے معمور ہوتے۔ مصنّفہ نے بڑی مہارت اور دل کش انداز سے رچناوی کی ثقافت میں وہاں کی عورتوں، مٹیاروں کو کھیتوں میں کام کرتے مردوں کے لیے کھانا لے جاتے ہوئے دکھایا ہے یعنی مرد کھیتوں میں کام کرتے اور عورتیں ان کے لیے کھانا لے کر جاتیں۔ طاہرہ اقبال نے دراصل یہ دکھایا ہے کہ وہاں کی عام خواتین، عورتیں اور مٹیاریں آزاد فضاؤں میں سانسیں لیتی تھیں جن کا نقشہ ناول میں مصنّفہ نے یوں کھینچا ہے:

نئی نئی جوان ہوئی مٹیاریں سورج نکلے جب مکھن چپڑی روٹیوں بھری رنگلی چنگیر لسّی کی کجی پر دھرے بدن کی کمان میں تیر سی چڑھی بنے بنے پیلیں ڈالتی مورنی سی جھنکارتیں دونوں بازو دائیں بائیں کولہوں پر مٹکتے مجال ہے جو ہاتھ کبھی سر پر رکھے بوجھ کی سمت اُٹھا ہو چاہے ٹھوکر لگے چاہے گندم کے فراز قد بوٹے پر چڑھی بالی اِدھر اُدھر سر گھمائے۔۔۔۔ پشت پر مور پنکھ جھنکارتے سینے پر غٹر غوں کبوتر بولتے۔ یہ جھنکار یہ غٹر غوں نوعمر لڑکوں

کے روم روم میں اُدھم مچا جاتی۔[۸]

رچنا کے لوگوں کی ثقافت میں متوسط گھرانے کے لوگوں کی عورتیں بھی بھرپور زندگی بسر کرتی تھیں جب کہ کمی کمین لوگ تو خواتین، مٹیاروں اور بچے، بچیوں کی کمائی سے مرد حضرات زندگی بسر کرتے تھے۔ اس کے علاوہ طاہرہ اقبال نے اس ثقافت کے بچوں کی نفسیات کو بھی پیش کیا ہے جو اپنے بڑوں کو تخلیے میں جنسی فعل کرتے دیکھتے اور جب کھیلنے کے لیے اکٹھے ہوتے تو اُن کی مشق کرتے ہوئے دہراتے۔ عمر کی پختگی تک وہ جنسی افعال سے بالکل واقف ہو جاتے کیوں کہ یہ تجربات وہ بچپنے میں ہی حاصل کر چکے ہوتے۔ مصنّفہ نے اسے ناول میں اس طرح پیش کیا ہے:

> پوری سنسان دوپہر کھلے احاطوں میں قطار در قطار کھڑے کوٹھوں کے سامنے اُسارے گئے بھڑولوں کے پیچھے چھوٹے بچے اور بچیاں وہ سب دہرانے کی مشق کرتے رہتے جو کوٹھے کے اندر اپنے ماں باپ، بھائی بھابھی، چاچا چاچی کو کرتے ہوئے دیکھتے۔ ڈالیوں پر چہچہاتے پرندوں کو چونچیں لڑاتے ہوئے دیکھتے، کھلے چوکوں میں بھینسوں، گائیوں کے ملاپ کے مناظر دیکھتے۔ ریوڑوں میں بکروں کی خرمستیاں سیکھتے۔[۹]

رچنا کی ثقافت میں عام لوگوں کے بچے زندگی کے تمام تجربات بغیر کسی کی رہنمائی کے سیکھ جاتے۔ ان پر معاشرتی روایات کا قدغن بھی نہ ہوتا۔ طاہرہ اقبال نے بڑی مہارت کے ساتھ رچناوی تہذیب کے ثقافتی عناصر کو نیلی بار میں پیش کیا ہے۔ ان عناصر میں لوک گیت بھی شامل ہیں۔ لوک گیت دراصل بار کے لوگوں کی زندگی کا عکس ہوتے ہیں۔ باروں کے لوک گیت سادہ، پُرسوز اور غنائیت سے معمور ہوتے ہیں۔ ان گیتوں سے مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو، رسوم ورواج، تہذیب و ثقافت، مذہب و سیاست، قدرتی مناظر کا بیان، قلبی جذبات کے علاوہ سماجی تعلقات ایسے موضوعات شامل ہوتے ہیں۔ ان لوک گیتوں میں ماہیا اور ڈھولا کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ماہیا ایک مختصر سی صنف ہے جس میں عشق و محبت سے لے کر معرفت جیسے مضامین کو موضوع بنایا جاتا ہے۔ ماہیا رچناوی ثقافت کا ترجمان لوک گیت ہے۔ ماہیا میں اس ثقافت کی رسومات، زبان اور لہجے کا مکمل اظہار ملتا ہے۔ طاہرہ اقبال نے اس صنف کو رچناوی زبان اور ثقافت کے معیارات کے تحت ناول میں پرویا ہے۔ وہاں کی مٹیاریں اس صنف کو ثقافتی آہنگ کے ساتھ الاپتی تھیں۔ ناول میں اس صنف کو مصنّفہ نے بہت عمدہ انداز سے پیش کیا ہے جس میں وہاں کی ثقافت کا نمایاں

رنگ رچا بسا ہوا ہے۔

چھور کمینہ دل لئی ویندا اے

قولاں دا جھوٹا دکھ دیتی ویندا اے[۱۰]

[کمینہ لڑکا میرا دل لے گیا ہے۔ قول کا جھوٹا مجھے دکھ دے گیا ہے۔]

اس ماہیا میں طنز کے ساتھ ساتھ اپنائیت کا احساس بھی مضمر ہے جو وہاں کے لوگوں کا وتیرہ تھا۔ پھر ڈھولا کا شمار بھی لوک گیت میں ہوتا ہے۔ رچناوی نظم کی اصناف میں سے ڈھولا ایک الگ اور منفرد صنف ہے جو دنیا کی اب تک سب سے طویل صنف مانی جانے والی انگریزی کی سانیٹ سے بھی طویل صنف ہے۔ خوشی، غم، جنگ، امن، محبت، ہجر یہ جذبات کے علاوہ بار کے لوگوں کے اجتماعی دکھ کو بھی ڈھولا کا موضوع بنایا جاتا ہے۔ ڈھولا کو گانے والے مویشیوں کو چَرانے والے اَن پڑھ چھیڑو ہوتے تھے۔ لوک گیتوں کی یہ صنف نسل در نسل رچناوی ثقافت میں منتقل ہوتی رہی ہے۔ مصنّفہ نے ڈھولا کی صنف کو بھی ناول میں برتا ہے۔ وہاں کے کسان کھیتوں میں پانی باریاں لگاتے پر درد ڈھولے الاپتے تو سارے جہاں کا درد مجتمع ہو جاتا۔ اس صنف کو ناول میں مصنّفہ نے یوں پیش کیا ہے:

سانوں عشق نمانا کیتا

اسا گبھروہاسے بار دے[۱۱]

[ہم بار کے قوی جوان تھے لیکن ہمیں عشق نے ناتواں کر دیا۔]

ناول میں ایک اور جگہ پہ مصنّفہ نے اس صنف کو برتا ہے جس میں رچناوی کی ثقافت ساتھ ساتھ انسانی وجود کا کرب بھی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ علاوہ ازیں مظلوم لوگوں کا نوحہ بھی شامل ہے جن پر مظالم کے پہاڑ گرا دیئے گئے تھے۔ طاہرہ اقبال نے عمیق مشاہدے کی بناء پر اس صنف کو ناول میں پیش کیا ہے:

پانی پاک سمندراں دے

یاری دو دن دی دُکھ ساریاں عمراں دے[۱۲]

ڈھولا رچناوی ثقافت کے لوک گیتوں کی نمائندہ صنف ہے جو ثقافت کی پہچان کا باعث بھی ہے۔ لوک گیتوں کے علاوہ لوک تفریحات کو رچناوی ثقافت میں منفرد حیثیت حاصل ہے۔ لوک تفریحات کسی بھی علاقے یا خطے کے لوگوں کی اجتماعی خوشی اور تفریحِ طبع کا باعث ہوتی ہیں۔ ہر علاقے یا خطے کی مخصوص لوک تفریحات ہوتی ہیں۔ اس لیے رچنا کی ثقافت کی بھی خاص لوک تفریحات ہیں جو اسے ثقافتی اعتبار سے

منفرد کرتی ہیں۔ میلوں ٹھیلوں کا انعقاد ہو یا بیلوں کی دوڑ، کتوں کی لڑائی، کبڈی یا کشتی ایسے کھیل لوگوں کی تفریح کا سبب تھے۔ کچھ کھیل انفرادی سطح پر ڈیروں پر بیٹھ کر کھیلے جاتے جنھیں بچے اور بڑے بھی کھیلتے۔ رچناوی ثقافت کی لوک تفریحات میں بہت سی چیزوں کو شمار کیا گیا ہے لیکن ناول میں جس ثقافتی کھیل کو پیش کیا گیا ہے وہ ''اڈے کھڈے'' کا کھیل ہے جسے مصنّفہ نے ثقافت کے ساتھ ہم آہنگ کرکے محرومی کے احساس کو دکھایا ہے۔ ناول میں سلطان عرف سلاجو زبان سے تھتھا ہے۔ سلا ایک لاوارث بچہ ہے جو ذیلدار کی بکریوں کا ریوڑ چَراتا ہے تو اس صلے میں اسے شام کے وقت بچے کھچے روٹی کے ٹکڑوں سے پیٹ کے ایندھن کو بجھاتا۔ اس ضمن میں جب وہ اڈے کھڈے کا کھیل کھیلتا تو ذیلدار کی بیٹی پاکیزہ جو خاندانی روایات کے قدغن میں کمرے میں قید تھی اُسے ساتھ کھیلنے کو کہتا۔ جسے مصنّفہ نے ناول میں اس طرح پیش کیا ہے:

> سرکنڈے کی پوری کو درمیان سے چیر کر دو ٹکڑوں میں تبدیل کر دینا ایسے چار ٹکڑے جو آٹھ کا ہندسہ بناتے تھے اُلٹے پڑیں تو آٹھ سیدھے پڑیں تو چار۔ ''پچیاں'' تھتھا کوئلے سے اڈے کھڈے کی لکیریں کھینچ کر اکیلا ہی کھیلنے لگا تھا، جب وہ چاروں تیلیاں ہاتھ میں کھنکھنا کر پھینکتا تو پاکیزہ کے برسوں سے بندھے سلے وجود میں سویا بچپنا انگڑائی لیتا لیکن اسے ہنسنے بولنے کھیلنے کی ممانعت تھی۔ اس ممانعت پر اک عمر کے شباب کا چڑھاوا چڑھادیا گیا تھا۔ باجی جی کھیڈ سو۔[۱۳]

اڈے کھڈے کا کھیل چار آدمی مل کر کھیلتے ہیں لیکن اسی کھیل کو اکیلے بھی کھیلا جاسکتا ہے۔ اڈے کھڈے رچناوی ثقافت کا بہترین کھیل ہے جسے ڈیرہ، چوراہوں میں وقت گزاری کے لیے کھیلا جاتا تھا۔ لوک تفریحات کے بعد شکار کے شوق ہیں جنھیں رچناوی کی ثقافت میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ شکار کا شوق ہر ثقافت میں انسانی زندگی کا مشغلہ رہا ہے۔ رچناوی ثقافت میں بھی لوگ خوب شکار کا شوق کرتے، کچھ شوق ایسے تھے جنھیں جاگیر دار، زمیندار اپنی تفریح طبع کے تحت کرتے تھے۔ جس میں مرغابی کا شکار خاص اہمیت کا حامل ہوتا تھا۔ ناول میں مصنّفہ نے مرغابی کے شکار کا نقشہ یوں کھینچا ہے جو رچناوی ثقافت کے رنگ سے مزین ہے۔ اقتباس دیکھیے:

> دونالی بندوقوں اور کارتوسوں کی پیٹیاں ملازموں کے کندھوں پر چڑھائی جاتیں۔ مغرب کے بعد شکاری واپس لوٹتے تھے تو مرغابیوں کی مختلف نسلیں سون ڈک نیل سرکے

ڈھیر چڑھ جاتے۔ مور پنکھ سے شوخ رنگ پروں والی مرغابیاں۔ لمبی چونچوں میں مٹی بھری ہوئی گہرے سبز سنہری پر جیسے دور تک گھسیٹے گئے ہوں خشک لہو سے اکڑے ہوئے اس حسین ترین پرندے میں بس یہ چلو بھر لہو تھا؟ جو اُسے ہزاروں میل اُڑانے کی طاقت عطا کر دیتا تھا۔[۱۴]

شکار کے شوق میں سے جہاں دیگر شکار کے شوق کیے جاتے تھے وہیں مرغابی کا شکار خاص سلیقے اور مہارت سے کیا جاتا تھا۔ شکار کے اس فن میں رچناوی ثقافت کے لوگوں کو مہارت حاصل تھی۔ اس کے علاوہ جانور پالنے کے شوق کیے جاتے تھے۔ یہ شوق خاص لوگوں سے لے کر عام لوگوں تک مقبول تھے۔ یعنی بیل پالنے کا شوق، گھوڑی پالنے کا شوق، بھیڑ، بکریاں اور بھینس پالنے کا شوق رچناوی کی ثقافت میں بہت عام تھے۔ ناول میں نیلی نسل کی بھینس کے شوق کو دکھایا گیا ہے۔ بھینس کی یہ نسل رچناوی ثقافت میں بہت مقبول ہے۔ اس نسل کی بھینس خریدنے کے لیے ملک بھر سے لوگ آتے ہیں۔

قدیم دور میں یہ شوق عروج پر تھا۔ عہدِ حاضر میں بھی یہ شوق بہت چاؤ کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ نیلی کی بھینس دودھ بہت زیادہ مقدار میں دیتی ہے۔ دیہی علاقوں میں آج بھی نیلی کی بھینس کو بہت شوق سے پالا جاتا ہے۔ مصنّفہ نے ناول میں اس شوق کو یوں پیش کیا ہے:

تقریباً آدھ کلومیٹر لمبی سمیٹڈ کھرلی کے دونوں اطراف بندھی نیلی نسل کی دودھل بھینسیں کھونٹوں کے گرد گول گول چکرانے لگیں۔[۱۵]

جانور پالنے کے شوق کے علاوہ "لوک فن" کو رچناوی ثقافت میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ لوک فن میں کسی بھی علاقے یا خطے کے لوگوں کا مختلف فنون میں دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے۔ اس میں بالخصوص بڑوں اور بزرگوں کی دانش کے تجربات کارفرما ہوتے ہیں۔ اسی دانش اور تجربات کی بناء پر علاقے کے بڑوں اور بزرگوں کی باتیں بسا اوقات حیرت میں ڈال دیتی ہیں۔ اس لیے رچناوی ثقافت میں لوک فن جو رائج العمل تھے ان میں گویٹر، کھراپیرا، تیراکی اور کوک ایسے فنون شامل تھے۔

یہ تمام فنون عہدِ حاضر میں بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں۔ مصنّفہ نے ناول میں جس فن کو پیش کیا ہے وہ "کھراپیرا" ہے۔ کسی بھی علاقے میں چوروں کا پتہ لگانے کے لیے کھوجیوں کی مدد لی جاتی ہے۔ کسی چیز کا کھوج لگانا ایک فن ہے۔ یہ فن کسی ذات یا قوم کے ساتھ منسوب نہیں ہے بلکہ ہر قوم اور

ذات میں ہو سکتا ہے۔ یہ ایک خداداد صلاحیت ہے۔ جائے واردات پر مجرموں کے پاؤں کے نشانات دیکھ کر مجرم کی عمر اس کی جنس اور بعض اوقات قبیلے کا اندازہ لگالینا اچنبھے کی بات ہے۔ اگر چالاک مجرم مختلف طریقوں سے اپنے قدموں کے نشانات کو بھی مٹادے تب بھی ذہین کھوجی اس کا سراغ لگالیتا ہے۔ اگر کھوجی تعلق کی بناء پر کسی مجرم کی پردہ کرتا ہو تو ایک اور کھوجی کو اس کام پر لگادیا جاتا ہے جو مجرم کو بے نقاب کر دیتا ہے۔ ناول میں ست بھرائی دلہن کی بارات کو جب ملک فتح شیر جھوک لنگڑیالاں والے لوٹ لیتے ہیں اور فتح شیر کا بیٹا عبدالرحمٰن ست بھرائی کو باپ کے کمرے سے نکال کر بھگالے جاتا ہے اور ایک عرصے بعد عبدالرحمٰن ست بھرائی کو اپنے گاؤں چھوڑ جاتا ہے۔ تب وہ عبدالرحمٰن کے عشق میں دیوانی ہو کر گھر سے نکل جاتی ہے تب گاؤں کے لوگ اور کھوجی اس کی تلاش کے لیے نکل پڑتے ہیں۔ طاہرہ اقبال نے رچناوی ثقافت کے لوگوں کو اس فن میں ماہر ہونے کے ناتے دکھایا ہے۔ طاہرہ اقبال کا خاص وصف یہ ہے کہ وہ تمام ثقافتی رنگوں کو گہرے مشاہدات کی بناء پر پیش کرتی ہیں۔ ناول میں کھرا پیرا کی مثال دیکھیے :

> کوئی پکڑووے پکڑو گئی رے گئی پھر سے گئی ادھل گئی۔۔۔ کھوجی لالٹین کی روشنی میں کھرے سے کھرا پکڑتے پکی سڑک کی سمت بڑھ رہے تھے۔ پچھلی تاریخوں کا چاند ابھی طلوع نہ ہوا تھا اور ستاروں سے بھرا آسمان سیاہی مائل ہری فصلوں پر تنا تھا۔۔۔ سوٹے، ڈانگیں، برچھیاں سونتے مردوں کا قافلہ جس بہک، جھوک بہنی کے قریب سے گزرتا۔ ہوشیار کسان پکارتے: اوئے سوانی نکل گئی نیں کہ رسہ کھولیج گیا نیں (عورت بھاگ گئی کہ جانور چوری ہو گیا۔)[۱۶]

''کھرا پیرا'' ایسا فن ہے جو آج بھی رچناوی ثقافت میں موجود ہے اگرچہ اس کی شکلیں مختلف ہیں جو جدید تقاضوں کے تحت بدل چکی ہیں مگر کہیں کہیں یہ فن آج بھی قدیم روایات کے تحت موجود ہے جو رچناوی ثقافت کو دیگر ثقافتوں سے ممتاز کرتا ہے۔ لوک فن کے علاوہ کچھ پیشے ہیں۔ رچناوی ثقافت میں پیشوں کو بھی خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ کچھ پیشے ایسے ہیں جو رچناوی ثقافت کی پہچان بنتے ہیں۔ ان پیشوں میں ایک پیشہ ''بڑے زمینداروں کے ہاں ملازمت'' ہے۔ رچناوی ثقافت کے قدیم دور میں ملازم محض روٹی، کپڑے پر اکتفا کر لیتا تھا لیکن دورِ حاضر میں ماہانہ اُجرت مقرر کی جاتی ہے۔ مویشی چَرانے اور پالنے کے لیے ملازم رکھے جاتے تھے اور کھیتی باڑی کے لیے بھی بڑے بڑے جاگیردار ملازم رکھتے تھے۔

بسا اوقات چھوٹے چھوٹے زمیندار راھک رکھ لیتے تھے جو مختلف حصوں پر کاشت کاری کرتے جو فصل کی کٹائی یا چنائی کے وقت حصہ دار زمیندار سے حصہ لے لیتا تھا۔ ناول میں مصنّفہ نے مویشی چَرانے کے پیشے کو پیش کیا ہے۔ سلطان عرف سلا جو لاوارث بچہ ہے ذیلدار کی بکریاں چَراتا اور شام کے وقت بچے کھچے روٹی کے ٹکڑوں سے بھوک مٹاتا ہے۔ طاہرہ اقبال نے اس ضمن میں جہاں رچناوی ثقافت کو دکھایا ہے وہیں عام انسانوں کے ساتھ ہونے والے استحصالی ہتھکنڈوں کو بھی پیش کیا ہے۔ طاہرہ اقبال نے ثقافت کی رَو میں جاگیر دارانہ نظام کی خرافات کو بھی ننگا کیا ہے۔ اس پیشے کو مصنّفہ نے ناول میں اس طرح پیش کیا ہے:

> یہ آٹھ نو برس کا سلا جس کے لیے حویلی میں کام میں نکل آیا تھا۔ وہ دن چڑھے ریوڑ لے کر نکلتا اور سورج ڈھلے دھوؤں دھولوں اور مٹیالے غباروں میں لپٹا لوٹتا تو دور سے ہی اُس کے گیت اُس کی آمد کا پتا دیتے۔ وہ کبھی کوئی طلب کوئی مدعا کوئی بات کرنا نہ سیکھا تھا، لیکن اُسے چرواہوں والے کئی گیت ازبر تھے۔ پلکوں اور ابروؤں سے لے کر پاؤں کے ناخنوں تک مٹی کے ایک ہی لبادے میں ملفوف سلا۔[۱۷]

بڑے زمینداروں اور جاگیرداروں کے ہاں ملازمت کا یہ پیشہ آج عہدِ جدید میں بھی قائم ہے مگر دورِ جدید میں اس کام کی اُجرت مقرر کی جاتی ہے لیکن سلطان عرف سلا محض روٹی کی حصول یابی کے لیے سارا دن پورے ریوڑ کو چَراتا۔ پیشے رچناوی ثقافت کی قدامت کا اہم ثبوت ہیں۔ پیشے کے علاوہ دستکاریوں کو بھی رچناوی کی ثقافت میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ دستکاریوں کا ہر تہذیب میں اہم کردار رہا ہے۔ رچناوی کی ثقافت میں دستکاریوں کو اس لیے بھی اہمیت ہے کہ یہاں خواتین بھی اس فن میں خاص مہارت رکھتی ہیں بلکہ یوں کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اس ثقافت کی دستکاریاں خواتین کی مرہونِ منت ہیں کیوں کہ رچناوی کی قدیم ثقافت نے اپنے ہاتھوں سے بنائی ہوئی اشیاء سے گھریلو اخراجات کو اُٹھایا ہے۔ ناول میں مٹی کے برتن اور چرخے کی مال پر پونی بُننے کی دستکاریوں کو پیش کیا گیا ہے۔ مٹی کے برتنوں کو ہر عہد اور ہر تہذیب میں بہت مقبولیت حاصل رہی ہے۔ رچناوی ثقافت میں بھی مٹی کے برتنوں کا رواج بہت عام تھا ان برتنوں کو بہت خوب صورتی سے بنایا جاتا تھا۔ ناول میں مصنّفہ نے مہاجر عورتوں کے چکنی مٹی سے بنے چولھوں کو دکھایا ہے جو رچناوی ثقافت میں دیدہ زیب اور دل کش دستکاری کے طور پر دیکھے جاتے تھے۔ ناول میں اس کی مثال دیکھیے:

مہاجرنوں کے چولہے چکنی مٹی سے بنے کنگروں میناروں والے خوب صورت بناوٹوں والے، جیسے کوئی آرائشی ظروف۔ اتنی محنت یہ عورتیں ایک چولہے پر کرتیں جتنی محنت ان کے مرد کھیت کے ایک بیگھ پر پسینہ میں بہادیتے تھے اور اجناس کی دوگنی اوسط اُٹھاتے تھے۔ یہ گہنوں سے بھی خوب صورت چولہے جیسے بیٹی کے جہیز میں رکھنا ہو انھیں کنگرے دار جھالریں، قوسیں، سوراخ، مینارے، ایک پوری آرٹ گیلری تھی۔[۱۸]

چکنی مٹی سے بنے چولہے رچناوی ثقافت کی خواتین جنھیں خاص ادا سے بناتی تھیں جو اُس ثقافت کے مختلف رنگوں سے بھرپور مزین ہوتے تھے۔ دورِ حاضر میں بھی رچناوی ثقافت میں مٹی کے برتن آج بھی بہت مشہور و معروف ہیں۔ مٹی کے بنے چولہوں کے علاوہ نیلی بار میں طاہرہ اقبال نے چرخے کی مال پر بُنی ہوئی پونیوں کو دکھایا ہے۔ یہ دستکاری بھی رچناوی ثقافت میں خواتین کے ہاتھوں پروان چڑھتی تھی۔ چرخہ ہمیشہ سے ہر ثقافت کا حصہ رہا ہے جس سے گھریلو استعمال کی اشیاء کے علاوہ خواتین سے متعلق اشیاء بھی بنائی جاتی تھیں۔ چرخے سے پونی بنانے کے عمل کو مصنّفہ نے یوں دکھایا ہے:

لڑکیاں چرخے کی مال پر پونی سے پونی جوڑتی، سوت کے موٹے موٹے گولے کاتتیں اور ملاپ اور جدائی کے گیت الاپتی ہیں۔[۱۹]

چرخے میں سوت کو کاتنے والی لٹھ کی پُرسوز آواز چونکہ ہجر کی علامت ہوتی ہے۔ اس لیے اس ثقافت کی مٹیاریں، عورتیں برہا کی آگ میں جھلستی ہجریہ گیت الاپتی رہتی تھیں۔ چرخہ ایک قدیم ثقافتی عنصر ہے۔ طاہرہ اقبال نے نیلی بار کے ثقافتی عناصر سادگی سے دکھائے ہیں۔

دستکاریوں کے علاوہ رسوم و رواج کو مصنّفہ نے پیش کیا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو انسان روزِ ازل سے ہی لاشعوری طور پر آباء واجداد کی چھوڑی ہوئی رسوم و رواجوں کا اسیر رہا ہے۔ ہر تہذیب میں بہت ساری سومات ہوتی ہیں مگر رسومات مشترکہ ہیں وہ خوشی کی رسومات اور غم کی رسومات ہیں۔

خوشی کی رسومات میں بھی بہت ساری رسمیں ہیں لیکن رچناوی ثقافت میں شادی بیاہ کی رسومات کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ شادی جو کہ ایک فطری عمل ہونے کے ساتھ ساتھ مذہبی فریضہ بھی ہے۔ شادی کا عمل ہر تہذیب میں ہوتا ہے لیکن رچناوی ثقافت میں اس کی اہمیت اس لیے دوچند ہے کہ اس کی رسومات بہت منفرد ہیں۔ شادی کی رسومات میں سے ایک رسم "گھڑولی" کی ہے۔ کھارے کی رسم سے

قبل دولہا کی ماں، بہن اور قریبی رشتے دار خواتین گھڑولی بھر کر لاتی ہیں۔ گھڑولی رنگین گھڑے کو سجا کر بنائی جاتی ہے۔ گھڑولی پر رنگین شیشے لگے ہوتے ہیں اور اسے سات کنوؤں یا سات نلکوں کے پانی سے بھرنا ہوتا ہے۔ اس دوران لڑکیاں دُعائیہ گیت گاتی ہیں۔ ناول میں طاہرہ اقبال نے ست بھرائی دلہن کی گھڑولی بھرنے کے منظر کو دکھایا ہے جو رچناوی ثقافت میں ایک بہت ہی منفرد اور دلچسپ ثقافتی عنصر ہے۔ اقتباس دیکھیے:

> اب دُلہن کی گھڑولی بھری جا رہی تھی، رنگلی جھجھری کے منہ پر لال چنری میں گڑ اور چاول باندھ کر دھرے تھے۔ گھڑولی کے گلے میں ہرے اور عنابی رنگ پھندنوں والے گانے لٹکتے تھے۔ چند قدم کوئی ایک سر پر رکھ چلتی تو دوسری باری لینے کو اُتاولی ہو جاتی۔ ڈھول کی تھاپ پر پورے گاؤں میں کنویں اور نلکے ڈھونڈتی پھریں۔ سات سہاگنوں نے سات پانیوں سے ست رنگے روغن والی گھڑولی کو بھرنا تھا۔[۲۰]

اس کے بعد کھارے کی رسم ادا کی جاتی ہے جس میں دُلہن کو سات نلکوں سے بھری گھڑولی سے نہلایا جاتا ہے۔ یہ بھی ایک خاص ثقافتی رسم ہے۔ ناول میں طاہرہ اقبال نے اسے اس طرح پیش کیا ہے جب سات نلکوں سے بھرے پانی سے ست بھرائی دلہن کو نہلایا جاتا ہے۔ اقتباس دیکھیے:

> اب چار پائیوں کی اوٹ بنا کر ست بھرائی کو کھارے چڑھایا جا رہا تھا۔ ہلدی ملے جو کے آٹے کی وٹیاں مل مل عمر بھر کی میل سکھیاں سہیلیاں اُتارنے لگیں۔
>
> سات پانیوں سے بھری رنگلی گھڑولی میں سے سات سہاگنیں پانی کے چلو بھر بھر نہلانے لگیں۔ چار پائیوں کے چہار اطراف دیوار بنائے کھڑی عورتیں کھارے کے گیت گا گا کر آنسوؤں میں بہے چلے جا رہی تھیں۔۔۔۔ نائین گیلے کپڑوں سے رگڑ رگڑ سانولی رنگت کو چمکانے لگی۔ کپاسی پھول سی موتیا بھامارتا کنوارا بدن خوشبوئی صابن کی مہک چھوڑتے سروٹے سے سیاہ بال۔ عورتوں نے چٹخارہ لیا۔
>
> ہائے نی! رُوپ چڑھ آیا ہے۔[۲۱]

کھارے کی رسم کے بعد مصنّفہ نے رخصتی کی رسم کو ناول میں پیش کیا ہے۔ دلہن کی رخصتی کے پُرسوز گیت الاپے جاتے ہیں۔ بارات ایک دیدہ زیب منظر ہوتا ہے۔ دولہے والے جہاں رخصتی کے وقت

ڈھول کی تھاپ پر خوشیوں بھرے گیت گاتے، رقص کرتے ہیں تو وہیں دلہن والے غمزدہ اور اُداس چہروں کے ساتھ دلہن کو الوداع کرتے ہیں۔ تب دولہے والے سہرا نما گیت گاتے ہیں۔ یہ سہرا نما گیت عمومی طور پر دولہا کی بہنیں گاتی ہیں جسے طاہرہ اقبال نے رچناوی ثقافت میں بہت شائستگی سے پیش کیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

> اب دلہن کی رخصتی کا مرحلہ آن پہنچا تھا۔ شب بھر ناچنے گانے والیوں نے پھٹے گلوں کے ساتھ رخصتی کے پُر سوز گیت چھیڑے اور دلہن کے گلے لگ لگ دھاڑوں دھاڑ رونے اور جدائی کے دل خراش بین ڈالنے لگیں۔ لڑکے والیوں نے سہرے کے گیت چھیڑ دیے۔
>
> تیرے سہرے دیاں پنج لڑیاں
> شادی ویرے دی
> تیرے گانے نوں لاواں
> شالا مانو جوانی
> جناں دے ستے ہوئے لال
> جناں دے کنڈلے کنڈلے وال
> سانوں لوڑ پنجاہ لڑیاں
> سانوں خوشیاں بہوں چڑھیاں
> میں انار کلیاں
> ڈھولا وچ کھڑی آں
> بہناں جھلن پکھیاں
> مستانی اکھیاں[۲۲]

سہرا بارکے لوگوں کا ثقافتی گیت جو شادی بیاہ کے موقع پر خاص طور پر بار کی عورتیں گاتی ہیں۔ رچناوی ثقافت میں شادی بیاہ کی رسومات ثقافتی اعتبار سے دیگر ثقافتوں سے بہت منفرد اور دلچسپ ہیں۔ اس کے بعد غم کی رسومات ہیں۔ غم کی رسومات میں سب سے اہم کسی فرد کا فوت ہو جانا ہے۔ خوشی انسانی زندگی کا حصہ ہے تو غم بھی انسانی حیات کا لازمی جُز ہے۔ قدرت کا قانون ازل سے طے ہے کہ جو اس دنیا میں آتا ہے آخر ایک روز دنیا کی تمام لذتیں چھوڑ کر اُخروی دنیا میں چلا جاتا ہے یعنی جس انسان کے پیدا ہونے پر خوشی کا

اظہار کیا جاتا ہے اُسی کے مرنے پر غم واندوہ کیا جاتا ہے۔ لہٰذا غم کی رسومات ہر تہذیب و ثقافت میں مختلف رواجوں کے تحت ادا کی جاتی ہیں۔ رچناوی ثقافت میں غم کی رسومات کو منفرد انداز سے ادا کیا جاتا ہے۔ غم کی رسومات میں سے ایک رسم ''وَین'' کی ہے۔ اس رسم کو طاہرہ اقبال نے ناول میں پیش کیا ہے۔ کسی فرد کے وفات پا جانے پر اس کے اہلِ خانہ، رشتے دار، عزیز واقارب آہ و گریہ زاری کرتے ہیں جسے وَین کہا جاتا ہے۔ رچناوی ثقافت میں خواتین وَین کرتی ہیں۔ وَین کو تین حصوں میں پیش کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں وَین کرنے والی عورت مرنے والے سے اپنا تعلق ظاہر کرتی ہے۔ دوسرے حصے میں مرنے والے نے جس طرح اس کے ساتھ برتاؤ کیا اُس کا اظہار ہوتا ہے جب کہ آخری حصے میں مرنے والے کی عدم موجودگی میں جو مسائل ہوں گے ان کا اظہار کیا جاتا ہے۔ رچناوی کی ثقافت میں خواتین کا وَین رقت آمیز مناظر کا روپ دھار لیتا ہے۔ مصنّفہ نے وَین کی رسم کو کہانی میں ثقافتی آہنگ کے ساتھ برتا ہے۔

ناول میں جب ذیلدار کی بیٹی بختاور عرف بختاں بی بی جو خاندانی روایات کے باعث کمرے میں بند تھی اور خوف کی اتھاہ گہرائیوں میں مبتلا تھی جسے ہر وقت باپ کا خوف رہتا اور ماں اُس سے ہر وقت یہ کہتی رہتی کہ اب کی بار غلطی کی تو ذیلدار گولی مار دیں گے۔ اسی خوف میں مبتلا بختاور وفات پا جاتی ہے۔ تب گاؤں کی خواتین وَین کھینچنے لگتی ہیں جسے مصنّفہ نے یوں پیش کیا ہے:

> ہائے آج محل ماڑیاں لرز گئیں آج اُونچی حویلیوں کے کنگرے بھر گئے۔ آج محلوں کی بیٹی مر گئی۔ آج بادشاہوں کے ویہڑے (صحن) پھوڑی پڑی۔ [۲۳]

پھر وڈے ملک کی وفات پر گاؤں کی خواتین وَین کھینچتی ہیں جسے مصنّفہ نے اس طرح پیش کیا ہے:

> ہائے جاگیروں کا بادشاہ، حویلیوں کا نواب۔
> پنچائیتوں کا چودھری۔۔۔ کچہریوں کا افسر، ہائے وڈا ملک۔۔۔ ہن کون جھیڑے نبڑے کون ہماتڑ داجھالو ہوئے۔
> نہ کبھی امریکا میں ایسا جنازہ اُٹھا نہ ہندوستان میں۔۔۔ ہائے سارا تھانہ کچہری ساری سرکار دربار اکٹھے ہوئے ہائے اجیا اکٹھ نہ ویکھیا نہ سنیا۔ [۲۴]

غم کی رسومات کے بعد رچنا کے لوگوں کے طرزِ زیست کو پیش کیا گیا ہے۔ کسی خطے کے لوگوں کا رہن سہن ہی اُس ثقافت کی پہچان کا موجب بنتا ہے۔ رچناوی ثقافت میں لوگوں کے طرزِ زیست کو بہت

اہمیت حاصل ہے۔ طرزِ زیست میں بہت سارے عوامل کا شمار ہوتا ہے لیکن ناول میں جس عنصر کو پیش کیا گیا ہے وہ "خوراک" ہے۔ خوراک انسان کی بنیادی ضرورت ہے لیکن رچناوی ثقافت میں اسے اس لیے بھی انفرادیت حاصل ہے کہ وہاں کے لوگ سادہ خوراک کا استعمال کرتے تھے۔ رچناوی ثقافت کے لوگوں کی پسندیدہ خوراک گندم کے آٹے کی روٹی، دیسی گھی، دودھ، لسّی اور چاول ہے۔ اکثر لوگ سال بھر گندم کی روٹی کھاتے ہیں۔ موسم سرما میں جوار، باجرہ اور مکئی کی روٹی بھی استعمال کی جاتی ہے۔ ناول میں مصنّفہ نے رچناوی کے لوگوں کی خوراک کو پیش کیا ہے جو بہت سادہ اور لذیذ ہے۔ مائیں جب اپنے بچوں کے لیے خوراک کا بندوبست اس طرح کرتی تھیں جس میں بھرپور ثقافتی رنگ نمایاں تھے:

> ہر روز صبح سویرے گیہوں کی موٹی موٹی روٹیوں کے بیچ مکھن کا پیڑا رکھ چھوڑتیں جو روٹیوں کی حرارت سے پگھلتا سوندھی خوشبو چھوڑتے یہ تنوری پراٹھے اُن کے سامنے رکھ چولہے کے انگاروں پر کڑکتے گھی کی رکابی میں کوٹے ہوئے گڑ کی بھیلی ملاتیں اور اوڑھنی کے پلو سے تام چینی کی بھری پلیٹ چھابی میں رکھ دیتیں۔ لسّی کی کجی میں نمک کی ڈلی ڈال ہاتھ سے اُسے کھورتیں اور سورج ڈھلے بھینس کا پچھلا تھن بھرا چھوڑا تیں اور آنکھ کے اشارے سے کہتیں "جادھاریں لے لے"۔[۲۵]

رچنا کے لوگوں کا یہ طرزِ زیست تھا جو سادہ خوراک پر مبنی تھا۔ نیلی بار ناول بار کے ثقافتی رنگوں سے بھرپور ناول ہے۔ کسی علاقے کی ثقافت وہاں کے لوگوں کے رہن سہن، رسوم و رواج اور بہت سارے میلانات سے عروج پاتی ہے۔ اس بارے میں ڈاکٹر سجاد نعیم اپنی کتاب چناب کنارے میں لکھتے ہیں کہ "کسی علاقے کی ثقافت وہاں کے باشندوں کی نفسیات، میلانات اور زندگی کے بارے میں شعور کو ظاہر کرتی ہے۔ وہ اپنے مظاہر سے خطے کی شناخت کا حوالہ بنتی ہے۔"[۲۶]

طاہرہ اقبال نے رچناوی ثقافت کے تمام عناصر کو اس کی نفسیات، میلانات اور رجحانات کے تحت دکھایا ہے۔ انھیں یہ ملکہ حاصل ہے کہ جہاں دیگر ادیب فکشن کے لکھاری سوچتے ہیں وہیں یہ ایک جست میں تمام مراحل کو عبور کر لیتی ہیں۔ نیلی بار ناول ثقافتی اعتبار سے اُردو ناول کی تاریخ میں نمایاں مقام رکھتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر شاہ محمد مری، ''فیوڈل معاشرے سے حالتِ جنگ میں''، مشمولہ: ہبڑپا، طاہرہ اقبال (جہلم: بک کارنر، فروری ۲۰۲۳ء)، ۱۴۔

۲۔ ڈاکٹر سلیم اختر، ادب اور کلچر (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء)، ۳۲۰-۳۱۹۔

۳۔ سبطِ حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء (کراچی: مکتبہ دانیال، آٹھواں ایڈیشن، ۱۹۸۹ء)، ۱۳۔

۴۔ منیر ابن رزمی، ''پیش لفظ''، مشمولہ: مانگی ہوئی محبت، اقبال عابد (ساہیوال: انور سنز، ۲۰۱۸ء)، ۲۔

۵۔ مستنصر حسین تارڑ، ''پیش لفظ''، مشمولہ: نیلی بار، طاہرہ اقبال (اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء)، ۸۔

۶۔ ڈاکٹر شاہ محمد مری، ''فیوڈل معاشرے سے حالتِ جنگ میں''، مشمولہ: ہبڑپا، طاہرہ اقبال، ۱۷۔

۷۔ آصف خان، ''پنجابی زبان دا پچھوکڑ''، مشمولہ: تریہہ ماہی رچناوی، شمارہ ۱، جنوری تا مارچ ۲۰۱۱ء: ۳۲۔

۸۔ طاہرہ اقبال، نیلی بار (اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء)، ۲۵۹۔

۹۔ ایضاً، ۲۰۱۔

۱۰۔ ایضاً، ۲۶۔

۱۱۔ ایضاً، ۳۱۔

۱۲۔ ایضاً، ۳۹۰۔

۱۳۔ ایضاً، ۳۸۹۔

۱۴۔ ایضاً، ۳۶۱۔

۱۵۔ ایضاً، ۱۰۲۔

۱۶۔ ایضاً، ۷۰-۶۹۔

۱۷۔ ایضاً، ۲۷۲۔

۱۸۔ ایضاً، ۲۶۸۔

۱۹۔ ایضاً، ۱۷۔

۲۰۔ ایضاً، ۲۲-۲۱۔

۲۱۔ ایضاً، ۲۴۔

۲۲۔ ایضاً، ۳۲۔

۲۳۔ ایضاً، ۹۴۔

۲۴۔ ایضاً، ۵۶۳۔

۲۵۔ ایضاً، ۴۳۰۔

۲۶۔ ڈاکٹر سجاد نعیم، چناب کنارے (لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۲۱ء)، ۲۳-۲۲۔